ارض القرآن کا سفر

از جناب محمد عاصم صاحب

(۶)

نجد کی عامی زبان ہمارا دوپہر کا کھانا ریاض کے ایک تاجر شیخ محمد بن عبدالرحمٰن الشویعر کے ہاں تھا۔ بیچاروں نے بڑا اہتمام کیا تھا، مگر دوسرے تمام حضرات نے ایک دوسری جگہ دعوت کی وجہ سے معذرت کر دی تھی۔ استاذ عبدالحکیم عابدین اسی روز اسی وقت ہوائی جہاز سے جدہ روانہ ہو رہے تھے۔ بارش بھی ہو رہی تھی، اس لیے دعوت میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا آدمی نہ تھا۔ شیخ شویعر کے ساتھ افہام و تفہیم میں ہمیں جو دقت پیش آئی، وہ یاد ہی رہے گی۔ اب تک ہمارا واسطہ یا تو شیوخ سے پڑا تھا یا کلیۃ الشریعہ کے طلبہ و اساتذہ سے، اور یہ سب فصیح زبان بولتے تھے، اس لیے ان سے افہام و تفہیم میں کوئی دقت پیش نہ آتی تھی۔ شیخ شویعر کی زبان میں ایک تو لکنت تھی، دوسرے وہ نجد کی ٹھیٹھ عامی زبان استعمال کر رہے تھے ہم نے ان سے عرض بھی کیا کہ ہم عامی زبان سمجھ نہیں سکتے، مگر شاید وہ بھی ہماری بات نہ سمجھ سکے یکنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ کی گفتگو میں سوائے اس کے کہ ہم ان کی باتوں کا ہاں یا نہ میں جواب دیتے رہیں، ان سے کوئی گفتگو نہ کر سکے۔ نجد و حجاز کی عامی زبان اگرچہ مصر، شام، عراق اور اردن کے مقابلے میں بڑی حد تک قابلِ فہم اور اقرب الی الفصحیٰ ہے، مگر پھر بھی اس کا اس وقت تک پوری طرح سمجھنا مشکل ہے، جب تک آدمی چند ماہ وہاں رہ نہ لے۔

مغرب کی نماز کے بعد ہم شیخ عبداللہ المشعری کے ہاں کھانے پر گئے۔ وہاں ان کے دوست استاذ سعید الجندول سے بھی ملاقات ہوئی، جو مکہ کے ہائی سکول المعہد العلمی السعودی کے انچارج ہیں۔ ان دنوں اپنے ایک کام کے سلسلے میں ریاض آئے ہوئے تھے۔ وہ بڑی زیرک

ریاض اور مکہ معظمہ کے نئے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی دین سے غفلت بلکہ بے راہ روی و بے زاری کی شکایت کرتے رہے۔

شاہ سعود کی مہمان نوازی عشاء کے بعد شیخ عبدالعزیز بن باز ہوٹل تشریف لائے۔ دن میں ان کے نام دمام سے شاہ سعود کا ایک تار آیا تھا جس کے ذریعہ سے انہوں نے اپنے ذاتی مصارف کی مد سے ہمارے سفر خرچ کے لیے تین ہزار ریال (تقریباً چار ہزار روپے) بھیجے تھے۔ چنانچہ شیخ عبدالعزیز اس وقت یہ رقم لے کر تشریف لائے تھے۔ ہم نے اسی وقت شاہ سعود کے نام شکریہ کا تار لکھ کر روانہ کر دیا۔ یہ صرف شیخ اور شاہ کے اخلاقِ کریمانہ کا کرشمہ تھا۔ ورنہ ہماری طرف سے کبھی اشارۃً وکنایۃً بھی ایسی کسی خواہش کا اظہار نہ ہوا تھا۔ ہم تو اس سفر میں صرف انتظامی سہولتیں چاہتے تھے۔

اگلے دن (۷ ارنومبر) جمعہ تھا۔ جمعہ کی نماز سے کچھ پہلے شیخ مناع القطان ہوٹل تشریف لائے اور ہمیں ساتھ لے کر شرکۃ المبانی المصریہ لے گئے، جو نئی عمارتیں تعمیر کرنے والی ایک کمپنی ہے۔ اس کے مدیر (ڈائرکٹر)، استاذ عبدالعظیم اور عادل مصری ہیں۔ ان کا تعلق بھی اخوان سے تھا اور اسی وجہ سے انقلاب کے بعد مصر سے ریاض آ گئے تھے۔ کمپنی کے احاطہ میں ایک چھوٹی مگر خوبصورت مسجد ہے، جس میں زیادہ تر کمپنی ہی کے مزدور اور ملازمین نماز پڑھتے ہیں۔ شیخ مناع القطان نے خطبہ جمعہ دیا اور نماز پڑھائی۔ بارش کی مناسبت سے خطبہ کا موضوع یہ تھا کہ جس طرح انسان کو روئے زمین پر زندہ رہنے کے لیے بارش کی ضرورت ہے، اسی طرح اسے مہذب اور امن وامان کی زندگی بسر کرنے کے لیے دین کی بھی ضرورت ہے۔ خطبہ نہایت ہی مؤثر اور فصیح زبان میں تھا۔ مصری علماء کی تقریر کی زبان یوں بھی فصیح ہوتی ہے لیکن جس شخص نے حسن البناء شہیدؒ کی صحبت بھی پائی ہو اس کی زبان میں فصاحت کے ساتھ سوز اور اخلاص کی بھی آمیزش ہو جاتی ہے۔

۳ بجے شیخ عبداللطیف کے ہاں ہماری کھانے کی دعوت تھی، اس لیے نماز کے بعد

ان کے ہاں حاضر ہوئے ۔ واپسی پر شیخ نے مولانا کو اور مجھے بہت سی کتابوں کا تحفہ دیا افسوس چودھری صاحب کی طبیعت اس روز اچھی نہیں تھی اور وہ ہمارے ساتھ دعوت میں نہ جا سکے تھے ، اس لیے کتابوں کے تحفہ سے محروم رہے ۔

ریاض اور مکہ کے درمیان ذرائع آمدورفت ہمیں اپنے پروگرام اور ارادے کے خلاف ریاض میں کئی دن زیادہ لگ گئے تھے ، اس لیے اب ہم جلد از جلد یہاں سے مکہ معظمہ روانہ ہونا چاہتے تھے ۔ ریاض سے جدہ اگرچہ ہوائی جہاز بھی جاتے ہیں ، لیکن ظہران سے روانہ ہوتے وقت ہمارے ذہن میں یہی تھا کہ ہم ریاض سے کوئی ٹیکسی لے لیں گے اور اسی سے مکہ معظمہ جائیں گے کیونکہ ہم اس ملک میں محض گزر جانے کے لیے نہیں بلکہ ملک اور اس کے تاریخی مقامات دیکھنے کے لیے آئے تھے ۔ مگر ریاض میں معلوم ہوا کہ یہاں سے مکہ معظمہ تک کوئی پختہ سڑک نہیں ہے ۔ اور راستے میں کہیں سخت پتھریلی جگہ آتی ہے اور کہیں سخت ریتلی ، اس لیے چھوٹی گاڑی کا تو سوال ہی نہیں ، کوئی بڑی گاڑی بھی مسافروں کو لے کر نہیں جاتی ۔ صرف باربرداری کے ٹرک آتے جاتے ہیں ، جو عموماً تین دن اور چار راتوں میں ریاض سے مکہ معظمہ یا مکہ معظمہ سے ریاض پہنچتے ہیں یہی ٹرک سامان کے ساتھ مسافروں کو بھی لے جاتے ہیں اور عموماً ۴۰ ریال (۵۲ روپے) فی کس کرایہ وصول کرتے ہیں ۔ مقامات کو دیکھنے کے خیال سے ارادہ ہوا کہ کسی ٹرک ہی کے ذریعے سفر کر لیا جائے لیکن معلوم ہوا کہ یہ ٹرک عموماً رات کو چلتے اور دن میں کسی جگہ ٹھہرے رہتے ہیں ، اس لیے ان کے ذریعے راستے میں کسی مقام کا دیکھنا ممکن نہیں ۔ پھر ریاض اور مکہ معظمہ کے درمیان سوائے طائف کے کوئی ایسا تاریخی مقام بھی نہیں ہے جس کا ہمارے مقصدِ سفر سے براہِ راست تعلق ہو ، کیونکہ ہم تو صرف ان مقامات کو دیکھنا چاہتے تھے ، جن کا تعلق یا قرآن پاک سے ہے ، یا سیرت پاک سے ۔ علاوہ ازیں ان دنوں بارش کی وجہ سے راستہ اور بھی خراب ہو گیا تھا اور کوئی ٹرک آجا نہیں رہا تھا ۔ ٹرک کے ذریعے سفر کرنے کے لیے لازماً ہمیں دو تین دن اور ریاض میں رکنا پڑتا ، اس لیے احباب اور ملنے والوں کے مشورے کے بعد یہ طے پایا کہ خود ہوائی جہاز

کے ذریعے جدہ روانہ ہوا جائے اور پھر وہاں سے مکہ معظمہ اور طائف جایا جائے، اور اپنا بھاری سامان کسی ٹرک کے ذریعے مکہ معظمہ بھیج دیا جائے۔ مگر اس میں بھی یہ مشکل سامنے آئی کہ کوئی ٹرک والا اس وقت تک سامان لے جانے کے لیے تیار نہ تھا، جب تک اس کا مالک اس کے ساتھ نہ ہو۔ مجبوراً یہ طے کیا گیا کہ کتابیں تو ظہران بھیج دی جائیں تاکہ وہاں سے ان کو پاکستان روانہ کر دیا جائے اور ہم نے اپنے ساتھ کا سامان لیکر ہوائی جہاز پر جدہ چلے جائیں۔ اس غرض کے لیے میں ہوائی جہاز کا وقت اور کرایہ معلوم کرنے کے لیے ہوائی اڈہ گیا۔ وہاں یہ معلوم کر کے سخت تعجب ہوا کہ ریاض سے جدہ تک ہوائی جہاز کا کرایہ ایک سعودی باشندے کے لیے سو ریال اور غیر سعودی مسافر کے لیے دو سو ریال ہے۔ معلوم نہیں یہ سعودی باشندوں کے لیے رعایت ہے یا غیر سعودی مسافروں پر جرمانہ؟ ہمارے لیے قومیت کے لحاظ سے کرایوں کے فرق کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ اپنے ملک میں ہمیں کبھی اس کا تصور بھی نہ ہوا تھا۔

عصر اور مغرب کے درمیان ہم شیخ عبدالرزاق عفیفی کے ہاں گئے۔ وہاں ان کے بہت سے سلفی احباب موجود تھے۔ انہیں جب یہ معلوم ہوا کہ ہمارا پروگرام اس سفر میں مصر جانے کا بھی ہے تو انہوں نے ہمیں قاہرہ اور اسکندریہ کے بہت سے سلفی حضرات کے پتے دیئے تاکہ وہاں پہنچ کر ان سے ملاقات کر سکیں۔

ایک دلچسپ انکشاف مغرب کے بعد ہوٹل واپس پہنچے تو وہاں ملاقات کے لیے آئے ہوئے حضرات کا ایک ہجوم موجود تھا جس نے رات گئے تک ہمیں یہ موقع ہی نہیں دیا کہ ہم کسی اور جگہ جا سکتے۔ آنے والے حضرات میں ایک صاحب (جو دراصل ہندوستانی تھے لیکن اب آٹھ دس سال سے سعودی مملکت ہی میں رہ رہے ہیں) مکہ معظمہ کے روزنامہ الندوۃ کے نمائندہ بھی تھے۔ بہت عمدہ اردو بول رہے تھے۔ انہوں نے مولانا سے اپنے اخبار کے لیے انٹرویو لیتے ہوئے مقصد سفر کے متعلق چند سوالات کیے۔ ان سوالات میں ان کا ایک سوال "حدیث اور فقہ کے متعلق مولانا کی رائے" کے بارے میں بھی تھا۔ اس سوال کی جو وجہ

انہوں نے بتائی وہ بڑی ہی تکلیف دہ تھی۔ شاید قارئین کو اس کے سننے پر یقین نہ آئے جیسا کہ اس کے پہلی بار سننے پر ہمیں بھی یقین نہ آیا تھا، لیکن جب نمائندۂ الندوہ نے بار بار یقین دلایا تو کم از کم ہم ان کے اس بیان کو غلط قرار نہ دے سکے۔ انہوں نے بتایا کہ ۵۸ء کے حج سے پیشتر مصر کے ایک پرچہ میں یہ شائع ہوا کہ مولانا مودودی حدیث اور فقہ کے منکر ہیں۔ اس کے بعد جب اسی سال لائل پور اور لاہور کے دو عالم ۔ جن کا پہلے جماعت اسلامی سے تعلق تھا ۔ حج کے لیے تشریف لائے، اور ان سے اس کے متعلق سوال کیا گیا، تو ان دونوں نے اس کی تائید کی۔ کلیۃ الشریعہ کے جو طلبہ وہاں بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے لائل پور ہی کے ایک اور صاحب کے متعلق (جو پہلے ریاض کے کلیۃ الشریعہ میں طالب علم تھے اور ہماری ریاض میں موجودگی سے پیشتر پاکستان واپس آگئے تھے) بتایا کہ انہوں نے مولانا مودودی کو بدنام کرنے کے لیے ریاض میں باقاعدہ مہم شروع کر رکھی تھی اور علماء کو مولانا کے خلاف بھڑکانے کے لیے انہوں نے یہ مشہور کر رکھا تھا کہ ۵۶ء میں حج سے واپسی پر مولانا نے اپنے سفرنامہ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کی قبروں کے قبے گرانے پر سعودی حکومت کی مذمت کی ہے اور اسے سخت بُرا بھلا کہا ہے ؏

کوئی بتلائے کہ ہم بتلائیں کیا

جدہ کے لیے روانگی اگلے دن (۲۸ نومبر) ہمیں ریاض سے روانہ ہونا تھا اس شہر کے شیوخ و عمائد نے جس اخلاص و محبت کا برتاؤ ہمارے ساتھ کیا تھا اس کا تقاضا تھا کہ روانہ ہونے سے پہلے ہم ان سے الوداعی ملاقات کرتے لیکن بارش کی وجہ سے یہ ممکن نہ ہوا۔ اس کے باوجود مولانا امیر عبد اللہ سے ملنے کے لیے گئے۔ اس ملاقات میں امیر عبد اللہ نے مولانا سے خواہش ظاہر کی کہ ہمیں ذاتی طور پر ایک موٹر مکینک، ایک درزی اور ایک مالی کی ضرورت ہے، اگر یہ تینوں آدمی پاکستان سے مہیا ہو سکیں تو بہت اچھا ہے" مولانا نے واپسی کے بعد کوشش کرنے کا وعدہ فرمایا۔

پاکستانی سفیر کا ٹیلیفون ہوائی جہاز کی روانگی کا وقت ۱۲ بجے دوپہر تھا۔ ۱۱ بجے کے قریب ہم ہوٹل سے اپنا سامان نکلوا رہے تھے کہ جدہ سے ہمارے نام پاکستانی سفیر چودھری علی اکبر خاں صاحب کا ٹیلیفون آیا جس میں انہوں نے ہمیں باصرار دعوت دی کہ جدہ آئیں تو ان ہی کے ہاں قیام کریں۔ انہوں نے جس محبت اور اخلاق سے یہ دعوت دی، اس کے پیش نظر ہمارے لیے اسے رد کرنا مشکل تھا۔

ہم ہوائی اڈہ پہنچے تو شرکۃ المیانی المصریہ کے مدیر استاذ عبدالعظیم اور بعض دوسرے احباب الوداعی ملاقات کے لیے وہاں موجود تھے۔ ہم نے ٹکٹ خریدے اور سامان کا وزن کرایا۔ ۳۰ کیلو فی کس سامان لے جانے کی اجازت تھی، اس طرح ہم کل ۹۰ کیلو سامان مفت لے جا سکتے تھے، لیکن ہمارے سامان کا کل وزن ۱۸۷ کیلو ہوا۔ زائد سامان یعنی ۹۷ کیلو کا کرایہ اپنے ساتھ رکھنے کی صورت میں ۱۹۴ ریال اور ہوائی جہاز کے گودام میں رکھنے کی صورت میں ۹۷ ریال بنتا تھا۔ ہمیں بہرحال یہ کرایہ دینا ہی تھا اور ہم اس کے لیے تیار تھے لیکن جب ہوائی اڈے والوں کو مولانا کی شخصیت کا علم ہوا تو انہوں نے بطور مہمان نوازی ہم سے زائد سامان کا کرایہ وصول کرنے سے انکار کر دیا۔ سعودی عرب کے سوا اس مہمان نوازی کا تصور آدمی اور کہاں کر سکتا ہے؟

اس روز ہوائی جہاز لیٹ تھا۔ تقریباً عصر کے وقت ہم ریاض سے جدہ روانہ ہوئے۔

جدہ وصولی ریاض اور جدہ کے درمیان تقریباً ۶۰۰ میل کا فاصلہ ہے۔ جہاز میں بیٹھے ہوئے چاروں طرف، بلکہ اوپر اور نیچے بھی بادل ہی بادل نظر آرہے تھے۔ جہاز کبھی بادلوں کے اوپر سے گزرتا، کبھی نیچے اور کبھی ان کے درمیان سے۔ دور سے بادلوں کے ٹکڑے بالکل دھنی ہوئی سفید اور چمکدار روئی کے پہاڑ نظر آرہے تھے۔ ہوائی جہاز سے بادلوں کا منظر بہت خوبصورت ہوتا ہے۔ مجھے اس سے پہلے یہ منظر دیکھنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے کے بعد جا کر مطلع صاف ہوا اور نیچے سے زمین نظر آنے لگی۔ مغرب کے وقت ہم جدہ کے

ہوائی اڈہ پر پہنچ گئے۔ اڈے پر چودھری علی اکبر خاں صاحب اور استاذ عبدالحکیم عابدین موجود تھے۔ ان کے ساتھ پاکستان کے ماسٹر عبدالحکیم صاحب بھی تھے جو ضلع لائل پور کے رہنے والے ہیں اور آج کل پاکستانی سفارت خانہ کے قائم کردہ ایک مدرسہ میں تعلیم کی خدمت انجام دے رہے ہیں۔ جہاز سے اترنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہاں بھی جہاز کے سامان کی تلاشی لی جائیگی کیونکہ ہمارا جہاز دراصل بیروت سے آرہا تھا۔ دوسرے مسافروں کی تو تلاشی ہوئی مگر ہمارا سامان کو یونہی چھوڑ دیا گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ رعایت ہمارے ساتھ ہوئی ہو، اور ممکن ہے کہ ریاض سے آنے والے تمام مسافروں کو تلاشی سے معاف رکھا گیا ہو۔ وہاں سے فارغ ہو کر ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر پہنچے۔ جدّہ میں پاکستانی سفارت خانہ تو شہر کے اندر ہے، لیکن چودھری صاحب کی قیام گاہ شہر سے تین چار میل کے فاصلہ پر ایک نئی آبادی میں اس سڑک پر ہے جو جدہ سے مدینہ منورہ جاتی ہے۔

ریاض میں گذشتہ کئی دنوں سے بارش کا سلسلہ جاری تھا اس لیے وہاں سردی اچھی خاصی ہو گئی تھی اور ہم نے اپنے گرم کپڑے نکال کر پہن لیے تھے۔ لیکن جدہ پہنچتے ہی گرم کپڑوں نے کاٹنا شروع کر دیا۔ وہاں ہمارے ہاں کے اپریل کا سا موسم تھا۔ معلوم ہوا کہ جدہ کی زیادہ سے زیادہ سردی بس اتنی سی ہے۔

اسی رات چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں مولانا کے اعزاز میں ایک پرتکلف اور شاندار دعوت کا انتظام تھا جس میں انہوں نے جدّہ کے بہت سے عرب تجار، پاکستانی حضرات اور اردن، ہندوستان اور بعض دوسرے ملکوں کے سفراء کو بھی بلایا تھا۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک مختلف موضوعوں پر باتیں ہوتی رہیں۔ ایک مصری ڈاکٹر صاحب بھی تشریف رکھتے تھے جو عرب قوم پرستی کی حمایت، نحاس پاشا کی تعریف اور حسن بنا شہید کی مذمت فرما رہے تھے۔ چودھری غلام محمد صاحب ان کی باتوں پر صبر نہ کر سکے اور کافی دیر تک بحث رہی۔ اس دعوت میں جن پاکستانی حضرات سے شرف نیاز حاصل ہوا ان میں جناب انور علی صاحب بھی تھے جو

آج کل سعودی اسٹیٹ بنک کے گورنر ہیں اور جنہوں نے سعودی حکومت کے مالیات کو سنبھالنے میں نہایت قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔

ہمارا ارادہ جدہ میں قیام کا نہ تھا۔ اصل مقصود مکہ معظمہ تھا، تاہم جدہ میں بھی بعض ایسے کام تھے جن کے لیے وہاں رکنا ضروری تھا۔

اگلے دن (۲۹ نومبر ۵۹ء) علی الصباح ہم چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ساتھ پاکستانی سفارت خانہ آئے اور اپنے پاسپورٹوں پر کویت، یمن اور بعض دوسرے ممالک کا مزید اندراج کرایا۔ کویت کے احباب کا اصرار تھا کہ سفر کا پروگرام اس طرح بنایا جائے کہ مصر و شام کے سفر کے بعد ہم لوگ کویت ضرور پہنچیں۔ یمن کے سفر کی بھی کوئی صورت نکل آنے کا امکان تھا، اس لیے پاسپورٹوں پر ان ممالک کا مزید اندراج ضروری تھا۔

مصری سفارت خانہ اس کے بعد چودھری علی اکبر خاں صاحب ہی کے ساتھ جمہوریہ عربیہ متحدہ کے سفارت خانہ آئے۔ جمہوریہ کا ویزا تو ہمارے پاس تھا، لیکن ہمیں اندیشہ تھا کہ کہیں مصر پہنچ جانے کے بعد جزیرہ نمائے سینا کے داخلہ میں کوئی رکاوٹ پیش نہ آجائے، کیونکہ یہ علاقہ فوجی ہے اور وہاں حکومت کی خاص اجازت کے بغیر داخلہ نہیں ہو سکتا۔ سفیر نے ہمارے نام اور پیشے لکھے اور یہ کہ کس غرض سے جزیرہ نمائے سینا جانا چاہتے ہیں۔ مصر میں جن لوگوں سے ہمیں ملنا تھا، ان کے نام بھی دریافت کیے اور پھر وعدہ کیا کہ اپنی حکومت کو لکھ کر معلوم کریں گے اور پھر ہمیں اطلاع دیں گے۔

مصری سفیر بڑے ہی پُرتکلف لہجے میں گفتگو کرتے رہے۔ غالباً تکلف کی وجہ یہ تھی کہ ہم سے ان کو مجبوراً فصیح عربی میں کلام کرنا پڑا۔ عام طور پر عرب ممالک کے تعلیم یافتہ لوگ بھی بے تکلف گفتگو عامی زبان ہی میں کرتے ہیں اور مسلسل فصیح زبان بولنے کی نوبت آجائے تو انہیں خاصی مشقت کرنی ہوتی ہے۔ گفتگو کے دوران انہوں نے اس بات پر بار بار زور دیا کہ اسلام عالمگیر مذہب ہے اور یہ کہ دنیا بھر کے مسلمان ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔

یہ بات ہمارے لیے قابل قدر تھی۔ مگر مصر میں قومیت کے تین تصورات بیک وقت چل رہے ہیں مصر کے اندر فرعونی تہذیب کا نعرہ لگایا جاتا ہے۔ عرب ممالک میں عرب قومیت کی علمبرداری کی جاتی ہے اور غیر عرب مسلمانوں کے سامنے اسلامی برادری کا ذکر اچھے خاصے جوش و خروش کے ساتھ کیا جاتا ہے۔

شیخ محمد نصیف مصری سفارت خانہ سے فارغ ہو کر ہم شیخ محمد نصیف کے ہاں انہیں سلام کرنے اور ان کی مزاج پرسی کرنے کے لیے حاضر ہوئے۔ شیخ محمد نصیف نہ صرف جدہ بلکہ پورے حجاز میں ممتاز ترین آدمی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں علم، دولت، حسنِ اخلاق تواضع ہر قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ عمر ۸۰ سال کے لگ بھگ ہے۔ دنیا بھر کے علماء اور اہل علم حضرات سے ان کے تعلقات ہیں۔ باہر سے حج کے لیے آنے والے تمام علم دوست حضرات جدہ میں انہی کے ہاں قیام کرتے ہیں۔ ان کا گھر گویا دنیا بھر کے اہلِ علم کے لیے عام مہمان خانہ ہے۔ ان کا ذاتی کتب خانہ نہایت شاندار اور وسیع ہے اور مقامی شائقین کے لیے اس کی حیثیت پبلک لائبریری کی ہے۔ عقیدہ و مسلک کے اعتبار سے سلفی ہیں لیکن مزاج میں بہت ہی اعتدال ہے۔ متقدمین علماء کی کتابیں چھپوا کر دنیا بھر کے اہلِ علم کو وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے ہیں۔ ۱۹۴۹ء میں مولانا مسعود عالم صاحب کا قیام بھی ان ہی کے ہاں ہوا تھا۔ ۱۹۵۶ء میں مولانا مودودی بھی ان ہی کے ہاں ٹھہرے تھے۔ اب بھی ہم ان ہی کے ہاں قیام کرتے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی مہمان نوازی نے ہمیں اپنے ہاں کھینچ لیا۔ شیخ نصیف صاحب اپنی روایاتی محبت اور حسنِ اخلاق سے پیش آئے۔ انہیں اس بات کا افسوس تو ہوا کہ اب کی مرتبہ ہم ان کے ہاں قیام نہ کر سکے، لیکن چودھری علی اکبر خاں صاحب کی وجہ سے اس کا اظہار نہ کر سکے۔ صرف اتنا کہا کہ "سفیر صاحب کا حق مقدم تھا" معلوم ہوا کہ ان کی آنکھیں خراب ہو گئی تھیں، جن کے علاج کے لیے وہ مصر گئے تھے اور ابھی چند دن پہلے وہاں سے واپس آئے تھے۔ اب بھی انہیں مکمل آرام نہ ہوا تھا۔

واپسی پر شیخ نصیف نے اپنی عادت کے مطابق چند کتابیں مولانا کو بطور ہدیہ پیش فرمائیں اور جدہ سے ہماری واپسی سے پہلے پہلے مزید کتابیں اور بھی بھیج دیں۔

شام کو اپنی کمزوری اور بیماری کے باوجود وہ بازدید کے لیے چودھری علی اکبر خاں صاحب کی کوٹھی پر تشریف لائے۔ اندازہ ہوا کہ عربوں کے ہاں "ردِّ زیارت" کی کس قدر اہمیت ہے۔ شیخ نصیف حجاز کی گذشتہ پچاس ساٹھ سال کی جیتی جاگتی تاریخ ہیں۔ حجاز میں ترکی عہد کے حالات و واقعات بڑی دلچسپی اور مزے سے لے کر بیان کرتے ہیں۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے علماء اور ادباء ان سے یہ حالات و واقعات سننے کے لیے اکثر ان کے ہاں جمع ہوتے رہتے ہیں۔ کسی کو حجاز کی گذشتہ تاریخ کے متعلق کوئی کتاب یا مضمون لکھنا ہوتا ہے تو وہ ان کے ہاں آکر واقعات اور ان کی ترتیب کا اطمینان کرتا ہے۔ جدہ اور مکہ معظمہ کے پرچوں میں کتنے ہی ایسے مضامین شائع ہوتے رہتے ہیں جن کے لکھنے والوں نے مواد زیادہ تر ان ہی کی مجلسوں سے لیا ہوتا ہے۔ ہمارے پاس وہ ایک گھنٹہ بیٹھے رہے اور سلطان عبدالحمید کے عہد کے حالات و واقعات سناتے رہے۔ اور واقعات تو مجھے یاد نہیں رہے۔ صرف ایک واقعہ اپنی انتہائی دلچسپی کی وجہ سے ذہن میں رہ گیا۔ انہوں نے بتایا کہ اس زمانہ میں غلاموں اور لونڈیوں کی خرید و فروخت کے لیے باقاعدہ بازار لگا کرتے تھے اور لوگ وہیں سے اپنی "ضرورت کا سامان" خریدا کرتے تھے۔ میں جوان ہو چکا تھا، لیکن ابھی میری شادی نہ ہوئی تھی۔ بعض دوستوں کے مشورے پر میرے والد مرحوم نے ایک دن مجھ سے کہا کہ دیکھو تم جوان ہو چکے ہو، لیکن ابھی حالات ایسے نہیں ہیں کہ ہم تمہاری شادی کر سکیں، اس لیے بہتر ہے کہ تم مکہ معظمہ چلے جاؤ اور اپنے لیے کوئی لونڈی لے آؤ۔ پہلے تو یہ بات مجھے اچھی نہ لگی۔ لیکن بالآخر والد کے دوستوں کے اصرار پر میں رضامند ہو گیا۔ اگلے دن مکہ معظمہ آیا اور غلاموں اور لونڈیوں کے بازار پہنچا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ مختلف دکانوں پر لونڈیاں باقاعدہ کھڑی ہوئی ہیں اور ان کی بولی دی جا رہی ہے۔ اور جو لوگ بولی دے رہے ہیں، وہ آگے بڑھ کر ان کے جسم کے ہر حصہ

کا۔ سوائے ایک حصہ کے ۔۔ ہاتھ لگا کر جائزہ نے رہے ہیں۔ اس منظر سے میری طبیعت اس قدر مکدر ہوئی کہ میں الٹے پاؤں بازار سے باہر نکل آیا۔ میں نے سوچا کہ جو عورت کسی مرد کو ہاتھ لگانے سے نہیں روک سکتی وہ آخر میرے کس کام کی ہو سکتی ہے؟

شیخ مصطفیٰ عالم | اگلے روز ۲ ر نومبر ہمارا پروگرام مکہ معظمہ روانہ ہو جانے کا تھا۔ لیکن صبح ہی نماز کے بعد شیخ مصطفیٰ عالم تشریف لے آئے۔ موصوف دراصل مصر کے رہنے والے ہیں۔ ان کا تعلق اخوان سے تھا، اس لیے جیل میں بھی رہے۔ ۱۹۵۶ء میں ان کی رہائی ہوئی اور یہ رہائی کے بعد حج کے لیے مکہ معظمہ آئے، لیکن پھر مصر واپس نہیں گئے۔ اس وقت سے ان کا قیام جدہ میں ہے اور یہاں ایک دینی مدرسہ میں تدریس کے فرائض انجام دے رہے ہیں۔ ہمارے پاس ایک گھنٹہ تک بیٹھے اور مصر میں اخوان کے حالات بتاتے رہے۔

عمرے کے لیے روانگی | ۱۱ بجے کے قریب وہ مبارک ساعت آئی کہ ہم نے غسل کیا، احرام کے کپڑے پہنے، دوگانہ مسنون نماز ادا کی اور پھر زبان پر لبیک اللھم لبیک ۔۔۔ کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جدہ میقات کے اندر واقع ہے اس لیے احرام کا اپنی قیام گاہ ہی سے باندھنا ضروری تھا۔ ہم نے اپنا زیادہ تر سامان تو چودھری علی اکبر خاں صاحب کے ہاں چھوڑا۔ اپنے ساتھ صرف بستر اور کچھ ضروری سامان لیا اور مکہ معظمہ جانے والی ٹیکسیوں کے اڈے پر پہنچے۔ وہیں استاذ عبدالحکیم عابدین بھی مل گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ مکہ معظمہ جا رہے تھے۔ ہم نے سات سیٹوں کی ٹیکسی ۲۴ ریال کرایہ پر لی۔ ٹیکسی کا یہ کرایہ حج کے علاوہ دوسرے دنوں کے لیے تھا، ورنہ حج کے زمانے میں حاجیوں سے جو کرایہ وصول کیا جاتا ہے وہ اس سے کم از کم دس بارہ گنا زیادہ ہوتا ہے۔

جدہ اور مکہ معظمہ کے درمیان ۴۵ میل کا فاصلہ ہے اور سڑک نہایت شاندار ہے نئی سکیم کے تحت اس وقت اس سڑک کو دوہرا کیا جا رہا تھا۔ ایک راستہ مکہ معظمہ جانے والوں کے لیے اور دوسرا مکہ معظمہ کی طرف سے آنے والوں کے لیے۔ دوسری نئی سڑک آدھی تیار ہو چکی

تھی اور خیال تھا کہ حج ۷۹ھ تک بقیہ سڑک بھی تیار ہو جائے گی، اس لیے ممکن ہے اب یہ مکمل ہو چکی ہو۔

راستے کے تاریخی آثار تقریباً پندرہ منٹ تو ہمیں جدہ ہی کی آبادی سے نکلنے میں لگ گئے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ یہ شہر کس قدر پھیل چکا ہے۔ اب بھی مکہ معظمہ کی طرف مزید آبادی بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اس کے بعد پہاڑی سلسلہ شروع ہوا۔ یہ وہی سلسلہ ہے جو بحر قلزم کے ساحل کے ساتھ ساتھ یمن سے اردن تک چلا گیا ہے۔ پھر ریگستانی علاقہ شروع ہوا۔ سب سے پہلی بستی جو ہمیں ملی وہ ام السّلم تھی۔ اس کے بعد بحرہ آیا۔ پھر حدہ سے گزر ہوا۔ ۴۲ میل چلنے کے بعد سڑک کی بائیں طرف ایک بستی آئی، جس کا موجودہ نام شُمَیْسِی ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس کا نام حدیبیہ تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں صلح حدیبیہ واقع ہوئی تھی جس جگہ پر صحابۂ کرام کا لشکر ٹھہرا تھا، وہ بالکل سڑک کے کنارے پر ہے اور اب وہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ اس مسجد پر رکنے کا ارادہ کیا، لیکن بعد میں یہ طے کیا کہ پہلے عمرہ سے فارغ ہو لیں۔ اس کے بعد کسی دن خاص طور پر اس مسجد کو دیکھنے کے لیے مکہ معظمہ سے آئیں گے کچھ آگے بڑھے تو سڑک کے دونوں کناروں پر بورڈ لگا ہوا تھا کہ غیر مسلم یہاں سے آگے نہ بڑھیں، کیونکہ حرم کے حدود شروع ہونے والے تھے۔ آدھ میل اور بڑھے تو حرم کے حدود بھی آگئے اور وہاں سڑک کے دونوں طرف اعلام الحرم (حرم کے نشانات) بنے ہوئے تھے۔ اس کے بعد جب مکہ معظمہ کی آبادی شروع ہوئی تو سامنے ایک پہاڑ صاف دکھائی دے رہا تھا، جس کے متعلق ڈرائیور اور استاذ عبدالحکیم عابدین نے ہمیں بتایا کہ یہی جبلِ نور ہے جس میں غارِ حرا واقع ہے۔ گزشتہ سفروں میں دونوں مرتبہ رات ہی کے وقت یہاں سے گزر ہوا تھا اس لیے اندازہ نہ ہو سکا کہ جبلِ نور یہاں سے بھی نظر آتا ہے۔

مکہ معظمہ میں حاضری آگے بڑھے تو عبداللہ بن کلیب سڑک پر کھڑے ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ یہ ہم سے ایک دن پہلے ریاض سے روانہ ہو گئے تھے اور پھر ایک دن جدہ میں ٹھہر کر

مکہ معظمہ آ گئے تھے۔ مسجد الحرام کے قریب ہی جس طرف سعودی ہسپتال اور لوہروں کی رباط ہے، ہمارے پاکستانی سفارت خانہ نے ایک چہار منزلہ عمارت کی تیسری منزل کرایہ پر لے رکھی ہے جو حج کے دنوں میں سفارت خانہ کے عملہ کے لیے دفتر کا کام بھی دیتی ہے اور اسی میں سرکاری وغیر سرکاری مہمان بھی، جنہیں سفیر صاحب اجازت دیں، قیام کرتے ہیں۔ حج کے سوا دوسرے دنوں میں یہ عموماً خالی رہتی ہے۔ اس کی دیکھ بھال اور گاہے بگاہے آنے والے مہمانوں کی خدمت کے لیے ایک ملازم بھی مقرر ہے۔ ہم جس وقت وہاں پہنچے تو حرم میں ظہر کی اذان ہو چکی تھی اور عین جماعت کا وقت تھا۔ ہم نے سامان نیچے ہی ایک دکاندار کی حفاظت میں چھوڑا اور خود جماعت میں شریک ہونے کے لیے حرم کا رخ کیا۔ حرم میں داخل ہوئے تو جماعت کھڑی ہو چکی تھی۔ ہم نے کعبہ ـــ زادھا اللہ شرفاً ـــ پر محبت و احترام بھری نگاہ ڈالی اور جماعت میں شامل ہو گئے۔ نماز کے بعد استاذ عبدالحکیم عابدین طواف کے لیے چلے گئے اور ہم اپنی جائے قیام کی طرف واپس آ گئے۔ سامان اوپر چڑھا کر مرتب کیا۔ اس کے بعد سفارت خانہ کی طرف سے فلیٹ کی دیکھ بھال پر متعین ملازم بھی آ گیا جو مشرقی پاکستان کا رہنے والا عبدالمصور نامی ہے۔ اس نے ہمیں چائے بنا کر پلائی جس پر ہم اس کے بہت ہی شکر گزار ہوئے۔

خطیبِ حرم سے ملاقات چائے کے بعد عمرہ کے لیے ہم نکل ہی رہے تھے کہ حرم کے خطیب شیخ ابوالسمح عبدالمہیمن آ گئے۔ ان کا مکان ہمارے بالکل سامنے اسی گلی میں تھا۔ انہوں نے جب مولانا کی آمد کی خبر سنی تو فوراً تشریف لائے۔ خیریت دریافت کرنے کے بعد گذشتہ مرتبہ (۱۹۵۶ء) حج کی مصروفیات کی وجہ سے ملاقات نہ ہو سکنے پر افسوس کرتے رہے۔ انہوں نے ہمیں کسی دن اپنے ہاں آنے کی دعوت بھی دی جسے ہم نے بخوشی قبول کر لیا۔

عمرہ اس کے بعد ہم عمرہ کے لیے نکلے۔ عمرہ کے لیے باب السلام سے داخل ہونا مسنون ہے۔ باب السلام میں داخل ہونے کے لیے ہمیں کافی لمبا چکر لگانا پڑا، کیونکہ ہمارا قیام باب ابراہیم کی طرف تھا اور باب السلام اس کی مخالف سمت میں واقع ہے۔ جس وقت ہم عمرہ (طواف،

مقام ابراہیم پر دو رکعتیں اور صفا و مروہ کے درمیان سعی) سے فارغ ہوئے، تو عصر کی اذان ہوگئی۔ ہم نے عصر کی نماز حرم ہی میں ادا کی اور پھر اپنی جائے قیام پر واپس آ گئے۔ ہم نے خود ہی ایک دوسرے کے سر کے بال قینچی سے تراش کر احرام کھول دیا۔ جسم میں اگرچہ سخت تکان تھی لیکن دل خوشی سے لبریز تھے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے اپنے گھر کی زیارت اور عمرہ کی سعادت پھر نصیب فرمائی۔ الحمد للہ الذی بنعمتہ تتم الصالحات

حرم کی تعمیر اس عرصہ میں ہمیں حرم کی توسیع اور نئی تعمیر کو دیکھنے کا بھی موقع ملا۔ توسیع تعمیر کا یہ کام بڑے زوروں پر جاری ہے۔ اس وقت تک صرف ڈیڑھ طرف سے عمارت مکمل ہوئی ہے۔ ساری عمارت دو منزلہ بنائی جارہی ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان مسعیٰ کو بھی دو رویہ اور دوہرا بنایا جارہا ہے بلکہ اسے تو مکمل کر دیا گیا ہے۔ جس وسیع پیمانے پر یہ تعمیر ہو رہی ہے، اسے دیکھ کر لوگوں کا اندازہ ہے کہ اس کی تکمیل میں کم از کم پندرہ سال اور لگیں گے، لیکن مکمل ہو جانے کے بعد حرم کی وسعت موجودہ وسعت سے ڈھائی گنا ہو جائے گی اور اس میں بیک وقت پانچ لاکھ آدمی نماز پڑھ سکیں گے۔ اس کا شمار یقیناً دنیا کی چند بڑی عمارتوں میں سے ہوگا۔ اندازہ یہ ہے کہ پوری تعمیر پر دو ارب روپے کے قریب سرمایہ صرف ہو جائے گا۔ یہ ساری تعمیر شاہ سعود اپنے ذاتی مصارف پر کرا رہے ہیں۔ شاہ سعود کے کارناموں میں اس کا شمار یقیناً سرِ فہرست ہے۔

(باقی)